تبصرہ کتب

نام کتاب	———	علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (ایک مطالعہ)
مرتبین	———	ڈاکٹر وحید قریشی' زاہد منیر عامر
ناشر	———	بزم اقبال' لاہور
قیمت	———	150 روپے صفات: 368 مجلد
سال اشاعت	———	دسمبر1994ء

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

مرتبین نے کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر صدیق جاوید کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے اس مجموعے کے لیے مضامین کی فراہمی میں تعاون کیا۔ اس مجموعے میں 16 مقالے اردو میں اور 4 انگریزی میں ہیں' جبکہ 8 ضمیمے ہیں۔ ماخذ اور تکملہ الگ سے شامل ہیں۔

کتاب کے مرتب معروف محقق ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ زاہد منیر عامر کے مقدمے کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں اقبال کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے فقیر سید وحید الدین' خالد نظیر صوفی' مرغوب صدیقی' عبدالقوی دسنوی' نظیر صوفی' ڈاکٹر سعید اختر درانی' ڈاکٹر وحید قریشی' اکبر حیدری کاشمیری' کلب علی خان فائق' ڈاکٹر جاوید اقبال' مالک رام' محمد حنیف شاہد' شیخ اعجاز احمد' سجاد حسین شاہ' زاہد منیر عامر' جین ماریک' عبدالواحد معین' اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے مقالے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی جامع ہے' اور سب نے علامہ کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے اپنے اپنے دلائل دیے ہیں۔ "تکملہ" کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخ پیدائش کے بارے میں اس امر کی تفصیل دی ہے کہ علامہ اقبال کی قطعی اور یقینی تاریخ پیدائش دستیاب نہیں' مگر ان کے قرین قیاس 1873ء کی تاریخ پیدائش درست ہے۔ انہوں نے مرکزی حکومت کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی اختلافی نوٹ میں یہی تاریخ پیدائش درست قرار دی تھی' تاہم کمیٹی کے دیگر اراکین نے 9 نومبر 1877ء کو درست تاریخ پیدائش قرار دیا' اور فیصلہ ہوا کہ جب تک کوئی مزید مواد دستیاب نہ ہو 1877ء ہی کو سال پیدائش تسلیم کیا جائے (مگر بعد میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا)۔

یہ کتاب تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور تقریباً" مقالہ نگار حضرات کے دلائل خاصے محکم ہیں' مگر بات وہی ہے کہ اصل تاریخ پیدائش خود اقبال اور اس کے لواحقین کو بھی معلوم نہ تھی' لہٰذا سرکاری طور پر فیصلہ کردہ 9 نومبر 1877ء ہی کو اقبال کی تاریخ پیدائش تصور کر کے دیگر تاریخوں کو صرف علمی تحقیق کا موضوع تصور کیا جانا چاہیے۔

نام کتاب	ـــــــ	اقبال کا شعلہ نوا
مصنف	ـــــــ	نعیم صدیقی
ناشر	ـــــــ	ادارۂ معارف اسلامی، منصورہ لاہور
قیمت	ـــــــ	90 روپے
سال اشاعت	ـــــــ	اگست 1994ء

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

محسنؐ انسانیت جیسی معتبر کتاب کے مصنف، تحریک اسلامی کے رہنما اور اسلامی ادب کی تحریک کے اہم رکن مولانا نعیم صدیقی شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور ممتاز صحافی ہیں۔ "اقبال کا شعلہ نوا" ان کی ان تمام صلاحیتوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ مختلف اوقات میں لکھے گئے یہ مضامین ان کی اقبال سے گہری محبت اور عقیدت کے عکاس ہیں۔ اس کتاب کا سب سے اہم مضمون ان کی اقبال سے ملاقات کا ہے جس نے ان کی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے اور انہوں نے تمام زندگی اقبال کا مرد مومن بننے کی کوشش کی۔ مولانا مودودی کی قیادت میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ان کی مساعی بڑی ہی قابل قدر ہیں۔

یہ مقالے چونکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، لہٰذا ان میں وحدت تاثر کے بجائے گونا گوں پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ کچھ مقالے بہت مختصر ہیں، اور چند ایک طویل۔ ان مقالات کا مقصد اقبال کا پیغام نئی نسل تک پہنچانا ہے۔ ان میں کچھ تنقیدی مقالات بھی ہیں، اور انہوں نے اقبال پر چھپنے والی کتب اور مضامین کو ہدف تنقید بناتے ہوئے ان پر بڑی گرفت کی ہے مثلاً ڈاکٹر سلیم اختر کے اقبال کے نفسیاتی تجزیے پر لکھتے ہیں کہ نفسیاتی تجزیہ چہ معنی وارد:

> "قلمی برادری کے وسیع رشتے سے میں اپنے بھائی جناب فاضل نفسیاتی تجزیہ کار سلیم اختر سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اپنے والدین کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرنا پسند کریں گے ـــــ اور اس کاریگری کے ہاتھ دکھانے ہوں تو تمام بزرگان ملت، اولیاء اور اتقیا کی صفیں آپ کے سامنے ہیں، کیا ان سب کا نفسیاتی تجزیہ شروع کر دینا چاہیے؟ پھر انبیاء و رسل کو بھی آپ کاہے کو استثناء میں رکھیں گے۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کوئی نفسیاتی تجزیہ کار خود اپنا تجزیہ کیوں نہیں کرتا! فرائیڈ کے فلسفہ تجزیہ نفس کے پس منظر میں اس کا مریضانہ ذہن کام کرتا ہے۔"

اس کتاب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اقبال سے متعلق انٹرویو بھی شامل ہیں۔ علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کے سلسلے میں مولانا مودودی فرماتے ہیں:

> "ایک دن علامہ کا خط یکایک حیدر آباد میں موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ تم پنجاب منتقل ہو جاؤ کیونکہ جنوبی ہند' آنے والے حالات کے لحاظ سے' ایک محفوظ علاقہ نہیں ہے۔ جو کام تم کر رہے ہو' اس کے لیے پنجاب میں میدان ہے۔"

مولانا نعیم صدیقی کی یہ کتاب علمی اور تنقیدی' دونوں لحاظ سے اہم ہے۔

نام کتاب	——	اقبالیاتی جائزے
مصنف	——	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
ناشر	——	گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور
قیمت	——	100 روپے
اشاعت	——	1990ء

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبالیات میں ایک معتبر نام ہے۔ "تصانیف اقبال' توضیح و تحقیق" اور "ادبیات اقبال" کے علاوہ بھی متعدد کتب کے مصنف اور مرتب ہیں۔ کتابیات اقبال ان کا خاص موضوع اور اہم نام ہے۔ اس حوالے سے 1985ء سے لے کر اب تک ہر سال اقبال پر ہونے والے کام کا جائزہ اور تجزیہ ان کا مرغوب موضوع ہے۔ اقبالیات تقریباً" ہر کتاب بلکہ ہر کارڈ تک ان کے پاس محفوظ ہے۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے جن موضوعات پر لکھا ہے' ان میں اقبالیات : ایک تعارف' اقبالیات کے گیارہ سال' 1984ء کا اقبالیاتی ادب' علامہ اقبال کی سوانح عریاں "اقبال درون خانہ" پر ایک نظر' عروج اقبال' عالم عرب میں اقبال شناسی' بھارت میں اقبالیات' اقبال جادو گر ہندی نژاد : ایک مطالعہ' بھارت میں مطالعہ اقبال کے دو زاویے۔ چند تبصرے اور چند پاکستانی مطبوعات شامل ہیں۔ اقبالیاتی جائزے کا عرصہ تحریر پندرہ سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اقبالیات پر چھپنے والی کتب کا تعارف کرایا گیا ہے اور کہیں کہیں ان پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب کی سب سے اہم خصوصیت اس کا معلومات افزا ہونا ہے کہ ڈاکٹر ہاشمی اقبالیات پر سب سے زیادہ باخبر اقبال شناس ہیں۔ ان کے تبصروں اور جائزوں کے مطالعے کے بعد ایک عام قاری بھی اقبالیات پر لکھی جانے والی کتب سے بہت حد تک آگاہ ہو جاتا ہے اور ان کتب کی افادیت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ "اقبالیاتی جائزے" طلبہ اور اساتذہ کے لیے یکساں مفید ہے۔

نام کتاب	ــــــــ	ارمغان اقبال
مصنف	ــــــــ	ڈاکٹر رحیم بخش شاہین
ناشر	ــــــــ	اسلامک پبلی کیشنز لاہور
سال اشاعت	ــــــــ	نومبر1991ء
قیمت	ــــــــ	44 روپے

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین اس وقت صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں اقبالیات میں اپنے تحقیقی ذوق کی بنا پر ان کا نام بڑا معتبر ہے۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین نے علامہ اقبال کی متفرق تحریریں تلاش کر کے "اوراق گم گشتہ" کے نام سے شائع کیں، اور اسی کتاب سے اقبالیات میں ان کا نام معروف ہوا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی آپ ایم۔ فل (اقبالیات) کے طلبہ کی تحقیق اور ریسرچ میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے متعدد تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں ارمغان اقبال، شیخ نور محمد پیرو مرشد اقبال، علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال، تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال، اقبال کا ایک نادر مکتوب، علامہ مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط، اقبال کا ایک گم شدہ اہم مکتوب، اقبال کا ذخیرۂ کتب، اقبال اور نقاش فطرت ایم اسلم شامل ہیں۔

اس کتاب میں ارمغان اقبال ایک اہم مقالہ ہے جو اقبال کی حقیقت اسلام اور فقہ اسلامی پر ایک مفصل کتاب لکھنے کی خواہش پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ نے مختلف زعما سے رابطہ کیا تاکہ وہ ان کی علمی معاون کر سکیں، اور اشارات اور بونس بھی اقبال نے لیے۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین نے اس کتاب کے ضمن میں اقبال کی خواہش اور کوششوں کو موضوع بحث بنایا ہے، مثلاً علامہ نے مولانا انور شاہ کشمیری کے دیوبند سے فارغ ہونے اور ڈابھیل کھنڈ جانے سے قبل اپنے ساتھ اس موضوع پر کام کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ مولانا انور شاہ صاحب کے ڈابھیل کھنڈ چلے جانے سے یہ منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔ بہت بعد میں علامہ کا مولانا مودودی سے رابطہ ہوا۔ مگر اس وقت علامہ بیمار تھے اور جب مولانا مودودی پنجاب آئے تو علامہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جو نوٹس ڈاکٹر شاہین نے اس مضمون میں فراہم کیے ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فقہ اسلامی پر ایک جامع کتاب کا خاکہ ہے۔ فکر اسلامی اور فقہ اسلامی میں یہ کتاب نئے رجحانات اور تصورات کی حامل ہوتی اور ایک جدید نظریاتی اسلامی معاشرے کی تشکیل کی اساس بنتی۔ شاہین صاحب کا یہ مقالہ

بڑا اہم ہے اور ہمارے علمائے دین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس خاکے کی بنیاد پر کام کریں' بالخصوص اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارہ تحقیق اسلامی اسلام آباد کی یہ مضمون خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے مراسم بڑے گہرے تھے۔ علامہ نے ان کے رنگ میں شاعری بھی کی۔ جدید تہذیب کے خلاف آپ کا رد عمل اور اسلامی درد علامہ کے لیے بہت توجہ طلب چیز تھی۔ اکبر ہی نے سب سے قبل یہ احساس لیا کہ یہ تہذیب ہمارے لیے سم قاتل ہے۔ یہودی بالادستی کے خلاف اکبر کی پیش رفت اور حوصلہ مندی ہی ہمارے اجتماعی شعور میں تصور آزادی کی کاشت کا باعث بنی۔ اقبال کے ہاں یعنی تنقید مغرب اکبر کے اثرات میں سے ایک ہے۔ ذاتی تعلقات سے قومی اور ملی مقاصد کی ہم آہنگی اقبال اور اکبر میں بڑی نمایاں ہے' اور پرویز رحیم بخش شاہین کے مقالے میں اسی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آج اکبر کی مغربی تہذیب پر پھبتیاں لایعنی اور بے معنی بلکہ مضحکہ خیز نظر آتی ہیں مگر جس دور میں انہوں نے مسلم شعور اور مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر میں ہلچل پیدا کی' اس میں اکبر کی زیرک نگاہی اور فطانت کی مسلمانوں کو بڑی ضرورت تھی۔

تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال کا مقالہ اقبالیات میں چھپ چکا ہے۔ اس سفر کی تفصیلات اور بعض جزئیات شاہین صاحب نے فراہم کی ہیں۔ اقبال کا ایک نادر مکتوب اور اقبال کا ایک گم شدہ اہم مکتوب اور اقبال کی ذخیرۂ کتب معلومات میں اضافے کی چیزیں ہیں' تاہم نقاش فطرت ایم اسلم اور اقبال ایک منفرد مضمون ہے کیونکہ متعدد کتب کے مصنف ہونے کے باوجود ایم اسلم کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ اقبال ہی نے انہیں ناول نویسی پر آمادہ کیا تھا۔ ایم اسلم ناول نگاری میں کوئی بلند معیار تو قائم نہ کرسکے' البتہ اس دور میں اسلامی شعور کی تشکیل میں ان کے حصے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کی یہ کتاب تحقیقی لحاظ سے ایک عمدہ کوشش ہے اور لائق مطالعہ ہے۔

نام کتاب	———	اقبال، مسلم فکر کا ارتقاء (فلسفہ)
مصنف	———	پروفیسر عطیہ سید
ناشر	———	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سال	———	1994ء
قیمت	———	99 روپے

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

پروفیسر عطیہ سید فلسفے کی ایک کہنہ مشق استاد، افسانہ نگار اور بلند قامت شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی صاحبزادی ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی حلقوں میں ان کی اپنی ایک شناخت ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے چودہ اہم ابواب میں یونانی فلسفے، معتزلہ، اشاعرہ، تصوف، تصوف کی مابعد الطبیعیات، ابن مسکویہ، ابن سینا، الغزالی، ابن رشد، البیرونی، عراقی، ابن تیمیہ اور ابن خلدون پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مسلم فلسفہ کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے افکار اور علامہ اقبال کے ہاں ان کے تذکرے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ فکر اقبال کے حوالے سے ان فلاسفہ کی یہ سب سے سنجیدہ تذکرہ ہے۔ پروفیسر عطیہ سید نے ان فلاسفہ کے بارے میں اقبال کی آراء کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ یوں یہ کتاب اقبال کے موقف کی تفہیم کے ساتھ ساتھ خود ان فلاسفہ اور ان کی تحریکات کو سمجھنے میں بھی معاون ہے، بالخصوص خطبات اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے پیش نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ اور وہ سنگ میل فلسفیانہ موضوعات پر جو اہم کتب شائع کر رہا ہے، یہ کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ تاہم اس کتاب میں ابن عربی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے دوسرے مسلم فلاسفہ کا تذکرہ بھی شامل ہونا چاہیے تھا جو فکر اقبال میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اقبال کے ذہن کی تشکیل میں ان کا نام کسی طور پیچھے نہیں۔ پروفیسر صاحبہ یقیناً آئندہ اشاعت میں اس ضرورت کا احساس کریں گی۔ کتاب مستند حواشی اور حوالہ جات سے مزین ہے۔ پروفیسر صاحبہ نے مسلم فلسفے کے حوالے سے اقبال کا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے، وہ بڑا عمدہ ہے۔ ہم اس اقتباس کو نقل کرتے ہیں:

> "اقبال، مسلم فلسفے اور افکار کی تاریخ کو ایک تسلسل کی شکل میں دیکھتے ہیں جو محض بکھرے ہوئے افکار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مربوط وحدت ہے۔ اس کے تسلسل کو ارتقائی کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ یونانی فلسفے کی غلامانہ پیروی سے بتدریج آزادی، انفرادیت اور جدت کی منزل کی طرف رواں رہا۔ اور اس کی بنیادی

وجہ وہ نظریاتی اختلاف تھا جو یونانی فلسفے اور قرآن کی روح کے درمیان یونانی ذہن اور مسلمانوں کی طبع کے مابین موجود تھا۔"

کتاب طباعت کے لحاظ سے خوبصورت ہے مگر پروف کی اغلاط بہت زیادہ ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال افکار اقبال (تشریحات جاوید) اقبال اکادمی' پاکستان' 116 میکلوڈ روڈ' لاہور۔

ناشر	:	اقبال اکادمی پاکستان
مجلّد	:	1994ء
قیمت	:	-/70 روپے (صفحات 130)
مبصر	:	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

فرزند حضرت علامہ اقبال' ڈاکٹر جاوید اقبال کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے اب تک بہت سی بین الاقوامی اقبال کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے پر مغز مقالے پڑھ کر داد تحسین حاصل کی ہے۔ ان کی کتاب "زندہ رود" کو جو پذیرائی ملی ہے' اس سے بھی اقبال دوست اور اقبالیین بخوبی آگاہ ہیں۔ کتاب زیر تبصرہ ان کی نئی کتاب ہے جو ان کے 15 ایسے خطبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے دس گیارہ برس قبل پاکستان ٹیلی ویژن پر یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کے لیے علامہ کے تصور خودی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق' ان کے بنیادی افکار کی وضاحت کی خاطر دیے تھے۔ چونکہ انہوں نے یہ آسان زبان میں لکھے' اس لیے خاصے مقبول ہوئے۔

کتاب ایک انتساب اور پیش لفظ کے علاوہ پندرہ مقالات پر مشتمل ہے۔ انتساب انہوں نے اپنے بھانجے اقبال صلاح الدین کے نام کیا ہے جس کا سبب ان کی اپنے نانا کے افکار کو سمجھنے کے لیے تگ و دو ہے۔ راقم (یزدانی) کو بھی اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ راقم نے عزیزم اقبال کو حضرت علامہ کے فارسی کلام کی تدریس کے دوران ان کے اس جذبے کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے۔ سارے دن کی کاروباری تھکن کے باوجود وہ وقت پر کتاب لے کر پہنچ جاتے اور پورے انہماک اور توجہ سے درس لیتے' تا آنکہ چند ہی مہینوں میں وہ فارسی کلام بڑی حد تک سمجھنے کے قابل ہو گئے' اور جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے' یہ کتاب بھی اقبال ہی کے اصرار پر شائع ہوئی۔

پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس کام کی نوعیت پر مختصراً" روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے دس گیارہ برس قبل لکھے ہوئے مقالوں پر نظر ثانی کر کے' اس مدت میں دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر' انھیں اپ ٹوڈیٹ کر دیا ہے۔ ان مقالات کی بنیاد انہوں نے علامہ کی شعری تخلیقات اور نثری کاوشوں پر رکھی ہے اور حسب ضرورت صرف نثری ارشادات کے حوالے دیے ہیں جس کا سبب ان کے بقول یہ ہے کہ: "عام طور پر اقبال کی نثر کی طرف توجہ نہیں دی جاتی' حالانکہ جو کچھ انہوں نے نثر میں ارشاد فرما رکھا ہے' اس کی روشنی میں ان کے کلام کو سمجھنا چاہیے۔"

کتاب میں شامل سبھی مقالات "خودی" ہی کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتے ہیں' مثلاً 1- خودی 2- خودی' عقل' مشاہدہ اور وجدان 3- خودی اور مشرق و مغرب کے فلاسفہ' 4- خودی' نبوت' ولایت اور ارفع شاعری 5- خودی اور حیات بعد الموت 6- خودی' اتحاد عالم اسلام اور

پسماندہ اقوام... وغیرہ۔ آخر میں' حواشی کی صورت میں وہ حوالہ جات ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب نے استفادہ کیا۔

جیسا کہ واضح ہے' علامہ کے فکر کی اساس "خودی" ہے جس سے ان کے دوسرے افکار مربوط ہیں۔ اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس موضوع کو کس انداز میں پیش کیا ہے۔ پہلے مقالے "خودی" میں حالات اور ماحول کے حوالے سے کہ اسی سے کسی مفکر کے خصوصی افکار سے آگاہی ملتی ہے' انہوں نے اس سیاسی اور تمدنی زوال کی بات کی ہے جس سے پوری دنیائے اسلام دو چار تھی۔ شروع میں اگرچہ علامہ کے یہاں بھی نفی ذات کی بات ہے' اور وہ بھی روایت کی پابندی کے سبب' تاہم وہ جلد اس دور سے نکل کر اپنے خاص موضوع کی طرف آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مغربی فلسفے اور نفسیات کے حوالے سے "شخصیت" اور "خودی" میں تفاوت کی وضاحت کی ہے۔ پھر حیات سے متعلق سائنسی نظریے اور ہندو فلسفے "مکتی یا نروان" کا مختصر ذکر کر کے دونوں کو اقبال کے حوالے سے رد قرار دیا ہے۔ اس مقالے کی باقی باتیں بھی علامہ کے چند اشعار کے حوالے سے ہیں---- یعنی خودی کیا ہے' اس کے جوہر کو زندہ رکھنے کے لیے تخلیق مقاصد کا تسلسل ضروری ہے--- تاہم ان کا انداز ایک طالب علم کے لیے قابل فہم ہے۔

"خودی کا استحکام" میں خودی کی تربیت کی بات ہوئی ہے۔ ان چار اقدار کا ذکر ہے جو خودی کے استحکام کا باعث بنتی ہیں۔ اول عشق ہے۔ علامہ کے عشق اور روایتی عشق میں فرق کی وضاحت کی گئی ہے۔ اقبال کا عشق' روایتی عشق کے برعکس "اپنے اندر سمو لینے یا جذب کر لینے کی خواہش ہے" (ص 8)۔ دوسری قدر فقر و استغنا ہے یا مادی آسائشوں سے بے نیازی۔ اس ضمن میں شاہین کی مثال آئی ہے جس میں اسلامی فقر کی تمام صفات موجود ہیں۔ پھر مشہور شاعر غنی کشمیری سے منسوب (گھر کو کھلا رکھنے اور تالا لگانے سے متعلق قصہ بیان ہوا ہے۔ نیز بو علی قلندرؒ کے ایک مرید کا واقعہ بھی منقول ہے۔ تیسری اہم قدر جرات اور چوتھی حریت ہے۔ تربیت کے تین مرحلوں کی تفصیل دے کر ان منفی قوتوں کی بات بھی کی گئی ہے جو علامہ کے نزدیک خودی کی تباہی یا کمزوری کا سامان کرتی ہیں۔

اجتماعی خودی میں بے خودی کی وضاحت ہے' اور فرد اور جماعت کے باہمی تعلق یا لاتعلقی کے بارے میں مفکرین نے جو مختلف نظریات پیش کیے ہیں' ان میں سے تین نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ ان تینوں نظریات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ فرد اور جماعت کا جو اٹوٹ ربط ہے' اسے یہ تینوں' کسی نہ کسی صورت میں' اہمیت نہیں دیتے۔ آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے اشعار اور دیگر مختلف حوالوں سے اس موضوع کی دل نشیں پیرائے میں وضاحت کی ہے۔

خودی' عقل' مشاہدہ اور وجدان میں' خدا کے وجود کے اثبات میں' ارسطو کی تین عقلی دلیلوں--- کونی' غائی اور وجودی--- کی وضاحت ہے۔ پھر اس سلسلے میں مختلف فلاسفہ' برکلے' کانٹ وغیرہ کے اقوال ہیں اور بعد میں علامہ کا یہ قول ہے کہ وجدان یا عرفان وغیرہ سے حاصل کردہ

معلومات کی پرکھ عقلی معیار اور عملی معیار سے ممکن ہے اور یہ کہ "عقلی معیار سے فلسفی کام لیتا ہے اور عملی معیار سے نبی" (ص 24)۔ اس کے علاوہ علامہ نے اس موضوع پر جو کچھ نثر میں کہا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اقتباس کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

خودی، علوم، ادبیات اور فنون میں علامہ کی بعض تقریروں اور ایک مضمون "جناب رسالت مآب ﷺ کا ہم عصر عربی شاعری پر تبصرہ" (جس میں امراء القیس سے متعلق حضور اکرم ﷺ کی رائے بھی شامل ہے) کے حوالے سے اس موضوع کی وضاحت ہے اور سورہ "الشعراء" کا بھی حوالہ آ گیا ہے۔

خودی اور مشرق و مغرب کے فلاسفہ میں اس بات پر زور ہے کہ "جدید یورپی تہذیب کی ابتدا فلسفیوں اور شاعروں کے افکار میں خودی کے احساس کے پیدا ہونے سے ہوئی" (ص 36)۔ اس سلسلے میں آگے چل کر تمام بڑے مغربی مفکرین اور مشرقی فلاسفہ کے اقوال سے بھی نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اگلے مقالے خودی، خدا، کائنات اور انسان میں انفرادی اور اجتماعی خودی کی بات کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صوفیاء کے برعکس، اقبال وصال کے بجائے فراق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یعنی وہ فنا فی اللہ ہونے کے بجائے "بقا باللہ" کے قائل ہیں، جبکہ بہبود ملت کی خاطر وہ فرد کے اپنا سب کچھ قربان دینے کے قائل ہیں۔ اس سوال کا "اقبال کے ہاں خدا کی فطرت کا تصور کیا ہے" جواب دے کر تخلیق کے عمل پر سوال اٹھایا ہے کہ "یہ عمل کیسے ہوتا ہے" یعنی خودی مطلق کے ہاں انکشاف ذات کی خاطر تخلیق کا کیا طریق کار ہے۔ علامہ کے شعری افکار سے اس کا سادہ انداز میں جواب ہے، اور یہ کہ "اقبال کا انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے گرد و نواح کی قوتوں یا وسائل کے ذریعے کائنات کی تقدیر متشکل کر سکتا ہے، نیز اس بتدریج تغیر پذیر سلسلہ عمل میں وہ خدا کا معاون اور ہم کار بن سکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔" (ص 49)

مقالہ "خودی، نبوت، ولایت اور ارفع شاعری" کا آغاز: معراج نبویؐ کے حوالے سے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے اس مشہور قول سے ہوتا ہے: "محمدؐ عربی فردوس کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے اور واپس آ گئے، خدا کی قسم! اگر میں اس مقام تک پہنچ سکتا تو کبھی واپس نہ آتا۔" اس میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی خودی کے زوال کے تین اسباب گنوائے گئے ہیں۔ سلاطین کی مطلق العنانیت، جو سیاسی زوال کا باعث بنی، علماء کی تقلید پسندی جس نے علم و فکر اور تمدن کو زوال سے دوچار کیا، اور صوفیاء کی بے عملی جس سے غیر اسلامی نظریات کو فروغ ہوا۔۔۔۔ تصوف کی مختلف تعریفوں، تصوف کے مثبت فائدے یعنی تبلیغ اسلام اور نتیجے میں بہت سے کفار کے مسلمان ہونے اور وجودی تصوف کی تعلیمات کے نتیجے پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ کے مذکورہ تصوف سے اختلاف کی بات کی ہے اور اشعار سے حوالے دیے ہیں۔

"خودی اور شیطان" میں اطالوی مستشرق باؤسانی کے اس قول کو کہ علامہ نے شیطان کی شخصیت کا یہ پہلو فکر یونان قدیم سے اخذ کیا ہے، رد کرتے ہوئے اسلامی ادبیات کی روایت کو اس کا سرچشمہ قرار دیا ہے، اور شیطان کے حوالے سے باؤسانی کے تین چار حوالے دے کر ڈاکٹر صاحب

نے کہا ہے کہ اقبال نے ایسی تمام نظمیں رومیؒ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں جن میں شیطان کا انداز معذرت خواہانہ ہے (ص 62)۔

"خودی اور جبر و اختیار" میں جبر و اختیار کے لغوی معنی دے کر اسلامی فلسفے میں اس موضوع پر پرانی بحث کا ذکر کیا ہے اور علم کلام کے نقطہ نگاہ سے صرف چند معروف مکتبہ ہائے فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں "جبریہ" اور "قدریہ" اور ان کے نظریات کا ذکر کر کے دو اور مکتبہ ہائے فکر کی کسی قدر تفصیل دی اور پھر اس ضمن میں علامہ کے نظریے کی وضاحت کی ہے' اور اس سلسلے میں رومیؒ اور علامہ کو ہم فکر بتایا گیا ہے۔ اس مقالے میں زیادہ تر اردو اشعار کے حوالے ہیں۔ مقالہ "خودی' اتحاد عالم اسلام اور پسماندہ اقوام" میں جمال الدین افغانیؒ کی تحریک اتحاد عالم اسلام' اس میں ناکامی کے اسباب اور ترکی میں خاتمہ خلافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ ترکوں کے اقدام کی کسی نے حمایت نہ کی "مگر اقبال برصغیر میں پہلی مسلم شخصیت تھے جس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ عالمگیر خلافت کا تصور اب فرسودہ ہو چکا ہے کیونکہ یہ تبھی قابل عمل تھا جب سارا عالم اسلام ایک مملکت تھی" (ص 105)۔ پسماندہ اقوام اور ان کے مسائل اور سپر طاقتوں کے ان اقوام کے ساتھ رویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ کے ان (اقوام) کے نام پیغام کی تفصیل دی ہے جو انہوں نے مثنوی پس چہ باید کرد... میں دیا ہے' اور آخر میں ان اقوام کی الگ "جمعیت اقوام" کے قیام سے متعلق علامہ کی تجویز دی ہے۔

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

آخری مقالہ "خودی' ترقی یافتہ اقوام اور انسانیت کا مستقبل" میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح یورپ کی صنعتی ترقی کے نتیجے میں جو بکثرت سامان تیار ہونے لگا' اس کی فروخت کے لیے عالمی منڈیاں قائم کرنے کی ضرورت نے ایک "جدید بیوپاری معاشرہ" جنم دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے استعمارے نے جنم لیا۔ اسی طرح اشتراکی نظام پر روشنی ڈال کر اس سے متعلق علامہ کی پیش گوئی (1930ء)____ "روسی عوام طبعاً" اور مزاجاً" مذہبی ہیں' اس لیے وہ ایسے نظام کو جو خدا کی ہستی کا منکر ہو' رد کر دیں گے" (ص 113) ____ کا ذکر کیا ہے جو اب درست ثابت ہو چکی ہے۔

آخر میں ترقی یافتہ اقوام کے سیاسی قائدین کے منافقانہ رویے اور ان کے پیش کردہ نظام ہائے ہیئت و معیشت کی خامیوں کا تذکرہ کر کے یہ بتایا ہے کہ احترام آدمیت اور اتحاد انسانیت سے متعلق ترقی یافتہ اقوام کے روشن خیال مفکرین جن خیالات کے اظہار کر رہے ہیں' وہ نصف صدی پہلے علامہ نے پیش کیے تھے (ص 118)۔

الغرض ان مقالات میں' بجز دو ایک مقالات کے' فاضل مصنف نے اشعار سے کم از کم استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے علامہ کی نثر سے بھرپور استفادہ اور ان کے منظوم افکار کو سادہ و دل نشیں نثر میں پیش کیا ہے۔ ان میں گزشتہ نصف صدی کے سیاسی و

معاشی حالات بھی آگئے ہیں اور خودی سے متعلق عام رٹے رٹائے انداز کے بجائے ایک عام فہم انداز میں اس کی توضیح و تشریح کی ہے جسے ایک طالب علم اور عام قاری بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ اب تک علامہ کے نظریہ خودی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' لیکن جو انداز ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا ہے' وہ سب سے الگ اور بے حد لائق اعتنا ہے۔ ایم اے (فارسی' اردو' فلسفہ) اور اقبالیات کے طلبہ کے لیے یہ ایک گراں بہا تحفہ ہے۔

کتاب : پاکستان کی دینی سیاست
تصنیف : چودھری مظفر حسین
تبصرہ : صلاح الدین ایوبی

چودھری مظفر حسین صاحب نے بہت عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں پاکستان کی دینی سیاست کا مطالعہ کیا ہے جس کے لئے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اس موضوع کو جس طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے' اس کی بنا پر دین کی ایک ایسی تعبیر سامنے آئی ہے جو اگر ایک طرف دین کے مصادر و منابع سے مطابقت رکھتی ہے تو دوسری طرف دور جدید کے تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ علامہ اقبال کے نظریات سے چودھری صاحب کو کلی اتفاق ہے' لیکن مولانا مودودی کی دینی سیاست پر انہیں متعدد اعتراضات ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ "اسلامی انقلاب بذریعہ اسلامی سیاسی پارٹی" کے نہایت مضر نتائج قرن اول میں بھی نکلے اور آج بھی ویسے ہی مضر نتائج بر آمد ہو رہے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں فرقہ بندی کی ابتداء سیاسی اختلافات کی بنیاد پر ہوئی ______ اور جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد برعظیم پاک و ہند کی سیاست' دینی سیاست اور قومی سیاست کے دو مختلف دھاروں میں تقسیم ہو گئی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودی نے اپنی جدوجہد کا آغاز تفہیم دین اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کے پروگرام سے کیا اور بہت جلد انہوں نے اپنی زوردار تحریروں کے ذریعے اپنے آپ کو دیگر علماء اور داعیان دین سے علیحدہ کر کے منوایا۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض "ترجمان القرآن" کی محدود اشاعت سے مولانا کو اس قدر نام وری نہیں مل سکتی تھی۔ مسلم لیگ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے تمام ہندو اخبارات وقتاً" فوقتاً" مولانا کی تحریروں کو ان کے چند سو قارئین کے سامنے سے اٹھا کر ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے کروڑوں پڑھنے والوں تک پہنچا دیتے۔ اس طرح مولانا مودودی اپنے مخصوص طرز عمل (دو قومی نظریئے کی حمایت' لیکن اس نظریئے کی بنیاد پر جدوجہد کرنے والی مسلمان جماعت کی مخالفت) کی بنا پر پورے برصغیر میں مشہور ہو گئے۔ پھر مولانا اس بات پر راسخ ہو گئے کہ دین کا صحیح تصور اور برصغیر کی سیاست کے بارے میں درست رویہ فقط وہی ہے جو ان کے قلم حقیقت بیان سے نکلا ہے۔ ازاں بعد اپنے فکر

اور طریق کار میں جو جو تبدیلیاں خود مولانا مودودی نے کیں' ان پر بھی انہیں کامل شرح صدر حاصل رہا۔ کسی بھی مخالفانہ رائے اور کسی بھی دلیل کو انہوں نے قطعاً" کوئی اہمیت نہ دی حتیٰ کہ اپنے بہترین رفقائے کار کو جو کلچرل طریق کار (تعلیم و تربیت) کو نسبتاً" زیادہ اہمیت دیتے تھے' ایک ایک کر کے کھوتے چلے گئے اور ایسے جذباتی انقلابی ساتھیوں کی رائے کے پیچھے چل پڑے جو انہیں بالآخر انتخابی سیاست کے خارزار میں گھسیٹ لائے۔

اس صدی میں کسی دینی جماعت کو سیاسی جماعت میں تبدیل کرنے کا اولین جرم مولانا مودودی ہی کی ذات سے سرزد نہیں ہوا بلکہ اگر یہ کوئی جرم ہے تو اس کی ذمہ دار جمعیت علمائے ہند تھی۔ مولانا مودودی نے' جو پہلے بھی ذہنی اور قلمی طور پر اسی ادارے سے کسی نہ کسی طرح منسلک تھے' جمعیت علمائے ہند کے تتبع میں ایک دینی جماعت تشکیل دی اور پھر اسے سیاسی عزائم سے لیس کر دیا۔ اگرچہ آپ نے اس بات کا خیال رکھا کہ کسی دینی جماعت کے سیاسی جماعت بن جانے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ وہ جماعت سیکولر بنتے بنتے کفار کی حاشیہ نشین بن جائے' تاہم دونوں جماعتوں کے مزاج میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا۔ دین کی تعبیر' ملت کے مجموعی مفادات اور سیاسی صورت حالات کے بارے میں انتہائی غلط فیصلے کرنے کے باوجود دونوں جماعتیں اسی زعم میں مبتلا رہیں کہ "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا" دونوں جماعتیں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مخالف تھیں۔ 1940ء میں مسلم لیگ نے ایک قومی و ملی تحریک کا اعلان کیا تو 1961ء میں جماعت اسلامی خم ٹھونک کر سامنے آ گئی۔ اگر جمعیت علمائے ہند نے گاندھی کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی تھی تو جماعت اسلامی بھی پیچھے رہنے والی نہ تھی۔ پاکستان بننے سے فقط تین ماہ پہلے مئی 1947ء میں ایک اہم ترین اجلاس میں جماعت اسلامی نے (جو ہمیشہ مسلم لیگ کی قیادت کے معیار اور قائدین کی سیرت و کردار پر کڑی تنقید کرتی رہی) گاندھی کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا تھا۔ اگر جمعیت علمائے ہند واضح طور پر قیام پاکستان کی مخالفت میں سرگرم عمل تھی تو جماعت اسلامی کا رویہ یہ تھا کہ "پاکستان بنے یا نہ بنے" چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں جماعتیں ملت اسلامیہ کے بجائے ملت کفر کے مقاصد کی ترجمان اور انہی کے مشاہیر کی دلدادہ تھیں۔

نفس مضمون کے حساب سے بظاہر یہ بات بہت عجیب لگتی ہے کہ علامہ اقبال کے نظریات سے بحث کرتے کرتے مسلم لیگ کیوں زیر بحث آ جاتی ہے۔ یہ بات تسلیم کہ مسلم لیگ علامہ اقبال کے کلچرل پروگرام کی نمائندہ نہیں تھی' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ تحریک پاکستان جیسے قومی و ملی پروگرام پر عمل پیرا تھی اور اس تحریک کی مخالفت صرف انہی گروہوں نے کی جو آئیڈیولوجیکل طریق کار کے حامی تھے۔ معلوم ہوا کہ اصل خرابی اس آئیڈیولوجیکل طریق کار ہی میں تھی۔ ان دینی سیاسی جماعتوں نے ملت کے مجموعی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھا اور قومی و ملی مشاہیر کی تضحیک' جبکہ لادینی عناصر کی تائید جیسا ناقابل فہم رویہ بھی اپنایا۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ مسلم لیگ کی مخالفت یا قیام پاکستان کی تحریک سے لاتعلقی' ایک ہی معاملے کے دو رخ ہیں' اس لئے کہ انگریز کا ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا جب نوشتہ دیوار بن گیا تو مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک کا نہ بننا

واضح طور پر یہی معنی رکھتا تھا کہ ایسا چاہنے والے' مسلمانوں کو ہندوؤں کے زیر نگیں دیکھنے کے متمنی ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ جماعت اسلامی اور خود مولانا مودودی کے افکار اور طریق کار میں جو تبدیلی مسلسل رونما ہوتی چلی گئی اور جس طرح مولانا مودودی نے اپنی جماعت کو تعلیمی و تربیتی پروگرام سے دور کرتے ہوئے موجودہ صورتحال تک پہنچا دیا' تو اس کا سبب یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے کارپردازوں نے اپنے فلسفہ افکار سے بڑھ کر ایسے دو بنیادی امور کو اہمیت دینا شروع کر دی جو سیاسی عزائم رکھنے والی ہر جماعت کا مقدر بن جاتے ہیں: اولاً" ـــــ اپنے امیر کے علاوہ کسی بھی اور شخص کی کسی بھی انداز میں قدردانی (خواہ وہ شخص کیسا ہی عالم و فاضل اور حکمت و نور بصیرت کا حامل کیوں نہ ہو) جماعت اسلامی کی نظر میں اپنی انفرادیت ختم کرنے اور اپنی اجتماعیت کو منتشر کرنے کے مترادف ہے۔ ثانیاً" ـــــ جماعت اسلامی کا پلیٹ فارم جماعت سے وابستہ افراد کی نظر میں کوئی علمی بنیاد فراہم کرنے یا اخلاقی تربیت کا کردار ادا کرنے سے زیادہ اس "خاندان" کی کفالت کا ذمہ دار قرار پایا ہے۔ تجارتی' صنعتی اور دیگر معاشی مفادات کے حصول کے لئے یہ پلیٹ فارم شخصی اور سیاسی روابط قائم کرنے میں پوری طرح مدد و معاون ثابت ہو رہا ہے' اور اب اس گروہ صالحین کے لئے یہی بہت کافی ہے۔

چودھری مظفر حسین کا خیال ہے کہ جب علامہ اقبال نے یہ بات کہی کہ: "اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں" تو قومی سیاست میں دینی اور سیکولر حلقے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اگرچہ دین اور دنیا کو جمعیت علمائے ہند پہلے ہی ایک سطح پر لا چکی تھی' تاہم وہاں یہ دلچسپ نظارہ دیکھنے کو ملا کہ علماء کا ایک بہت بڑا متدین گروہ سیکولر بلکہ کافر و مشرک سیاست دانوں کا حلقہ بگوش ہو کر رہ گیا۔ بہرحال "سیاست کار" تو سیاست میں موجود تھے ہی' کوئی بھی چھوٹی یا بڑی جماعت قائم ہوتی دکھائی دے' یہ سیاست کار اپنی تمام تر کمزوریوں سمیت اس میں آ شامل ہوتے ہیں۔ تاہم مسلم لیگ کی ذیل میں یہ فرق ضرور دکھائی دیتا ہے کہ "قیام پاکستان" کے نظریئے جیسا ایک اعلیٰ و ارفع قومی و ملی' اور بہرحال دینی مقصد سامنے لا کر مسلم لیگ نے تمام صاحب دل اور دردمند افراد کو سیاست کے میدان میں اپنا ہم سفر بنا لیا۔ ان میں دانشور اور مفکر بھی تھے' صوفی و ملا بھی' اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ بھی تھے' اور درس نظامی سے فارغ التحصیل بھی۔ مشائخ عظام بھی تھے اور مریدان باصفا بھی' نواب اور جاگیردار بھی تھے' کاشتکار اور مزدور پیشہ بھی ـــــ غرض' ایک بھرپور عوامی تحریک کے انداز میں قومی و ملی سوچ رکھنے والے سبھی افراد اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ساری اثر آفرینی اس عظیم مقصد ہی کی تھی جس نے "بن کے رہے گا پاکستان!" اور "پاکستان کا مطلب کیا ـــــ لا الہ الا اللہ!" کے نعروں کی صورت مجسم ہو کر عوام و خواص کو ایک مرکز نگاہ عطا کر دیا۔ وگرنہ جس قسم کے ذہنی طور پر پس ماندہ اور پس کردار لوگوں نے بالآخر مسلم لیگ پر قبضہ جما لیا' یقیناً علامہ اقبال کو یہ منظور نہ تھا۔ ایسی مادر پدر آزاد سیاست کو علامہ کے افکار کا پرتو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ "دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں" کا اصل مفہوم یہی

لینا چاہئے کہ جو اخلاقی حدود و قیود دین نے مقرر کر رکھی ہیں' انہی کو اپنی دنیا پر بھی لاگو کرنا ضروری ہے۔ اس طور پر اعلیٰ اقدار حیات اور اخلاقی حدود و قیود کی پابندی ہی درحقیقت اقبال کے کلچرل پروگرام کا مطمع نظر ہے۔

مولانا مودودی نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو انہوں نے ایک "آفاقی جدوجہد" کو اپنا مطمع نظر قرار دیا۔ مولانا نے یہ کہہ کر کہ : "اصل مسئلہ کفر اور اسلام کی کشمکش کا مسئلہ ہے" ملت اسلامیہ کے تمام مسائل اور خاص طور پر ملت اسلامیہ ہندیہ کے اصل مسئلے سے چشم پوشی اختیار کی۔ محکوم' معاشی طور پر پس ماندہ علم و ہنر سے کوسوں دور ـــــ کروڑوں مسلمانوں کا المناک ماضی' دردناک حال اور وحشتناک مستقبل ـــــ درحقیقت یہی مسائل مسلمانوں کے اصل مسائل تھے ـــــ اور کفر اور اسلام کی کشمکش میں کفر کے غلبے ہی سے ان مسائل نے جنم لیا تھا ـــــ چنانچہ کسی بھی پہلو سے غور کریں تو اولین ترجیح یہی بنتی تھی کہ سب سے پہلے اغیار کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔ اسلام کی آفاقی نمائندگی کے لئے اٹھنے والوں نے انگریز اور ہندو کے غلبے کے خلاف ہونے والی جدوجہد میں مسلمانوں کی نمائندگی سے دانستہ اعراض کا رویہ اپنا لیا۔ "نقلی مسلمانوں" کو اصلی مسلمان بنانے کا عزم رکھنے والوں نے فقط دس بارہ برس کی مساعی کے بعد ہی انتخابی سیاست کے دھارے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ـــــ یہ جائزہ لئے بغیر کہ قوم کی ذہنی و اخلاقی تربیت ایک فیصد بھی ہو سکی یا نہیں۔ جماعت اسلامی کے کارپرداز اپنے امیر کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ مسلمانان پاکستان آپ کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے ہمہ تن گوش ہیں۔ آپ ایک بار انتخابات میں کود پڑیں' ساری قوم کے ووٹ آپ ہی کے ہوں گے۔ مولانا مودودی نے اسی زعم میں مبتلا ہو کر 1970ء کے الیکشن میں متحدہ قومی محاذ کے خلاف کم و بیش سو سیٹوں پر اپنے آدمی کھڑے کر دیئے۔ اگر وہ اس طرح سے ووٹ تقسیم نہ کرتے تو گمان غالب ہے کہ نہ بھٹو اتنی بڑی کامیابی حاصل کر سکتا نہ مجیب الرحمن ہی! آج بھی ویسے ہی موقع شناس' مفاد پرست اور خوشامد پسند افراد جماعت اسلامی کے مرکز پر قابض ہیں اور ویسے ہی نتائج نکلنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔

ہی یہ بات کہ پاکستان کی دینی سیاست کو صحیح رخ کیونکر دیا جا سکتا ہے تو چودھری مظفر حسین کی رائے کے مطابق ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا علم عطا کر رکھا ہے' انھیں چاہئے کہ وہ اپنی تمام تر دیگر دلچسپیاں ختم کر کے علم کی ترویج و اشاعت اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ظاہر ہے کہ تبلیغ دین کا فریضہ ہرگز ہرگز ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتا جنہیں "تفقہ فی الدین" حاصل نہیں۔ یہ بات بھی پوری طرح پیش نظر رہنی چاہئے کہ علامہ اقبال کا اسلام کو ایک کلچرل موومنٹ بنانے کا نظریہ اس شرط کے ساتھ اپنا لیا جائے کہ (جدید سیکولر اذہان کے نظریئے کے برعکس) کسی بھی قوم کا کلچر اس قوم کے ماضی اور انسانی عادات و خصائل پر ہی مبنی نہیں بلکہ کلچر کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں وہ اقدار جن کی بنا پر اس قوم کا ایک مجموعی مزاج ڈھل کر سامنے آتا ہے اسلام نے جو اعلیٰ اقدار ہمیں عطا کی ہیں (ایسی اعلیٰ اقدار جو روز و شب بدلتی نہیں رہتیں۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی بھی ہے تو یہ کہ ان

کے مدارج ہمہ وقت ترقی پذیر رہتے ہیں) فقط ایسی ہی اقدار حیات کو اس کلچرل موومنٹ کا نقطہ آغاز بنانا ہو گا جو اسلام کو ایک آفاقی مذہب بنا سکتی ہیں۔

اگرچہ چودھری مظفر حسین صاحب نے بالتفصیل یہ بیان کر دیا ہے کہ مولانا مودودی کا آئیڈیولوجیکل طریق کار علامہ اقبال کے کلچرل طریق کار سے کس حد تک مختلف ہے' تاہم انہوں نے مولانا مودودی کے طریق کار سے نکلنے والے نتائج کو ایک ایک کر کے شمار نہیں کیا۔ مولانا مودودی کا طریق کار مختصراً" یوں ہے: "ایک تربیت یافتہ گروہ تیار کیا جائے _____ اور پھر اس گروہ کے ہاتھوں اسلامی انقلاب برپا کیا جائے" یہی طریق کار امام خمینی نے ایران میں اختیار کیا؟ تاہم یہاں اس انقلاب کے نتائج اور مضمرات سے بحث ہمارا مقصود نہیں۔ مولانا مودودی کے طریق کار سے جو تربیت یافتہ گروہ وجود میں آیا یا وجود میں آ سکتا ہے' وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہو گا۔

1- حد درجہ گروہی تعصب میں مبتلا
2- اپنے امام کو واحد مقتدا جاننے پر ایمان رکھنے والا
3- مزاجاً" انقلابی _____ ہمہ وقت لڑنے مرنے کو تیار
4- وقتی نعروں سے متاثر ہونے والا ____ جلد باز' جذباتی
5- کامل تقلید کا درس ملنے کی بنا پر اجتہاد سے کوسوں دور
6- نظریات و افکار سے مسلح' لیکن نور بصیرت سے قطعاً" عاری

یہی سبب ہے کہ آج کی جماعت اسلامی ایک نظریاتی دینی جماعت اور کسی آفاقی پروگرام کی حامل ہونے کے بجائے ایک "مافیا" میں تبدیل ہو چکی ہے۔ نہ کوئی علمی تحقیقی پروگرام ہے' نہ کوئی اخلاقی تربیتی نظام! نہ اجتہاد کی صلاحیت ہے نہ وجدانی صلاحیتوں کی جلا کی لگن!! لے دے کر ایک گروہی تعصب باقی رہ گیا ہے جو اپنے فدائیوں کو شمار تو کر سکتا ہے' ان کے علم اور سیرت و کردار کو جانچنے کی صلاحیت سے قطعاً" بے بہرہ ہے۔

بظاہر یہ بات بہت معقول نظر آتی ہے کہ جب تک ایک خاصی بڑی تعداد ______ بہت بڑی نہ بھی ہو تو موثر اقلیت _____ ایسے افراد کی موجود نہ ہو جو دین کا فہم بھی رکھتی ہو' دین کے تقاضوں پر عمل پیرا بھی ہو اور ذوق جہاد اور شوق شہادت بھی دلوں میں موجزن ہو ______ تب تک کسی بھی قوم پر اور کسی بھی ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صوفیا (متصوفین نہیں) کے طریق کار اور اس سے پیش آمدہ نتائج کو چھوڑ کر (جو علامہ اقبال کے کلچرل طریق کار کی ابتدائی سطح قرار دی جا سکتی ہے) جب اور جہاں کہیں کسی داعی دین نے آئیڈیولوجیکل (بالآخر سیاسی یا غیر سیاسی) طریق کار کو اپنایا ہے' کسی نہ کسی نئے گروہ اور نئے فرقے سے ملت اسلام کا واسطہ ضرور آ پڑا ہے' اور محولہ بالا ناپسندیدہ اوصاف اس گروہ کے ماننے والوں میں ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔ سبب اس امر کا یہ ہے کہ نبی کی ذات کو چھوڑ کر ہر وہ شخص جو قائد تحریک اور قائد انقلاب بن کر اٹھے گا بالآخر ریاکاری اور تکبر کا شکار ہو جائے گا اور اس کے متبعین عصبیت جاہلیہ میں مبتلا ہو کر رہ جائیں گے۔ ایسے قائدین کو اپنی جدوجہد کے ثمرات

دنیا کے سامنے لا دکھانے کی بہت جلدی ہوا کرتی ہے اور ان کے تربیت یافتہ افراد ایسے عسکری دستے ہوتے ہیں جو چین سے اپنی پیرکوں میں بیٹھ کر "اللہ ہو" کا ورد نہیں کر سکتے۔ "مختصر راستے" کے بے چین متلاشی ہر دوسرے "ازم" کا بظاہر دلفریب راستہ اور اسی کا کلچر اپنانے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کے ساتھ سوشلزم اور جمہوریت کا پیوند لگاتے ہوئے جمعیت علمائے ہند' جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کو ذرا بھی ردوکد گوارا نہیں ہوا' جبکہ علامہ اقبال جس طرح کمیونزم اور سوشلزم کے مخالف تھے' بعینہ ان کے قلم حقیقت ترجمان سے جمہوریت کے حق میں بھی کوئی کلمہ خیر نہیں نکلا۔ جمعیت علمائے ہند اور جماعت اسلامی نے لادینی نظریات کو اپنا کر پوری قوم کو ایک ایسی دو رخی پالیسی اور دوغلے پن سے آشنا کر دیا جس نے سارا معاشرتی نظام تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ نہ براہیمی نظر باقی ہے نہ تعلیم آدمیت!! افراد' خاندان' اداروں اور بحیثیت مجموعی معاشرے کی سطح پر وہی تہذیبی اور ثقافتی مظاہر دیکھنے کو مل رہے ہیں جو سوشلزم اور جمہوریت پرست مغربی دنیا اور لادین عناصر کو مرغوب ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے ہمیں یہ واضح سبق دیا ہے کہ آئیڈیولوجیکل طریق کار اپنانے والے بالاخر اپنے کلچر کا خانہ خراب کر کے چھوڑتے ہیں۔

✢ ✢ ✢

کتاب	:	خانخانان نامہ
مولف	:	منشی دیبی پرشاد کا ستھ
ناشر	:	انسٹیٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین سٹڈیز' کراچی یونیورسٹی
سال اشاعت	:	1990ء طبع پنجم
قیمت	:	60 روپے
مبصر	:	محمد اصغر نیازی

دیکھنے میں دیدہ زیب' خوبصورت اور مصور سرورق' کاغذ دبیز' نفیس اور پروف ریڈنگ معیاری۔ گویا ہر لحاظ سے ایک دلکش کتاب ہے۔ اس کے علاوہ آخری صفحے کی تصویر مغلیہ دور کی شاہی معاشرت کے کئی خوبصورت روپ پیش کرتی ہے۔

جناب ڈاکٹر حسن علی بیگ نے منشی دیبی پرشاد کی ایک سوانحی کتاب "خانخانان نامہ" جو پہلی بار 1879ء میں چھپی' تصحیح و تحشیہ کے بعد ایک جامع تعارف اور ایک مکمل حرف آغاز کے ساتھ بڑے دلاویز انداز میں شائع کروائی ہے۔ مزید برآں انہوں نے طبع جدید کے لیے سلیم کلیانوی سے ایک مکمل اشاریہ بھی مرتب کروایا ہے جو انہی کے قلم سے "بیرم خان کی زندگی' ایک نظر میں" اور "عبدالرحیم خانخانان کی زندگی' ایک نظر میں" کے اضافے کے ساتھ تالیف کی تاریخی واقعیت اور تدریسی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہے۔

"خانخانان نامہ" کے لیے ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی اور ڈاکٹر ریاض الاسلام نے انگریزی زبان میں ایک دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ تاریخی تحقیق و تفتیش میں درپیش مشکلات کے ذکر اور "خانخانان نامہ" کے مولف اور مرتب کی تالیف قلب کے بعد انہوں نے انسٹیٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز' کراچی یونیورسٹی کے کام' نام اور اشاعتی خدمات کے بارے میں بھی تحسین کے چند جملے سپرد قلم کیے ہیں۔ اس قابل تقلید ادارے کا ایک مکمل (انگریزی) تعارف بھی شامل کتاب ہے جس میں تاریخ کے موضوعات پر اس ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبان لکھتے ہیں:

" The Institute of Central and West Asian Studies

which is mainly devoted to research and studies of the medieual history and culture of the region and has among its priorities, the publication of the text of rare works, is greatly indebted to Dr. M.H.A. Beg for collaborating with us in the publication of the khan-i-Khanan Nama.

ہندوستان کی تاریخ میں خاندان مغلیہ کا دور حکومت دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے سب سے تابناک اور بھرپور ہے۔ اسی طرح ہر بادشاہ کے دور میں کچھ لوگ تابندہ ستاروں کی طرح روشن نظر آتے ہیں۔ خان عبدالرحیم خانخاناں اور ان کے والد خان بیرم خان کا شمار ایسی ہی منفرد اور یکتائے روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ اگرچہ "خانخانان نامہ" میں بیرم خان کا ذکر خاصا مختصر اور تشنہ سا ہے اور ذیلی عنوان بھی صرف "سوانح عمری خانخاناں عبدالرحیم خان" سے عبارت ہے۔ ایسے میں ایک مبصر یہ کہہ سکتا ہے کہ "خانخانان" میں ان سب حضرات کا تفصیلی ذکر ہونا چاہئے تھا جنہیں اپنے اپنے زمانے میں یہ لقب ملا اور جن کے کارنامے بعد میں آنے والے خانخانان کے لقب سے ملقب حضرات کے لیے مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ مغلیہ پر لکھی جانے والی، خصوصاً درسی کتابوں میں خانخاناں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کچھ درج نہیں ہوتا۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ شاید یہ ان کے نام یا قومیت کا حصہ ہے۔ "خانخانان نامہ" کا متن بھی ایسی کسی توضیح سے خالی ہے، البتہ ڈاکٹر حسن علی بیگ حاشیے میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ مغلیہ دور حکومت کا ایک اعلیٰ فوجی اعزاز تھا۔ بیرم خان اور عبدالرحیم خان کو اپنے اپنے عہد میں یہ خطاب ملا تھا۔ لیکن عبدالرحیم خان سے یہ خطاب ایک بار چھن بھی گیا تھا۔ جب بادشاہ نے اسے دوبارہ اس خطاب سے نوازا تو، بقول مولف "ماثر الامراء" واس ننگ و ناموس کو برباد کرنے والے دنیا پرست بڈھے، (عبدالرحیم خان) نے یہ شعر نگینے میں ثبت کروایا

مرا لطف جہانگیری ز تائیدات ربانی
دوبارہ زندگی دادہ، دوبارہ خانخانانی

میرے خیال میں عبدالرحیم خان کا یہ ردعمل فطری تھا۔ اسے بنیاد بنا کر مولف "ماثر الامراء" نے ان کی پوری شخصیت پر جس طرح اتہام تراشی کی وہ مناسب نہ تھی۔

منشی دیبی پرشاد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ وہ (عبدالرحیم خان) شجاعت، سخاوت، دانش اور تدبیر ملکی میں بے شک سرآمد روز تھا لیکن کینہ پروری، دنیا پرستی اور زمانہ سازی میں بھی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ہندو مصنف کے یہ دونوں رویے متضاد ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کے جملوں سے کیا سمجھا جائے۔ ہندو مورخوں کا مسلمانوں کے بارے میں روایتی متعصبانہ رویہ یا تاریخی تحقیق کے حقیقت پسندانہ اسلوب سے اغماض کا شاخسانہ ہے کیونکہ ایک عام قاری اور طالب علم کو ایک

تسلسل سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ خانخانان' چاہے وہ بیرم خان تھا یا عبدالرحیم خان و گوناگوں اور بوقلموں صفات سے بہرہ ور شخصیت کے مالک تھے۔ ہمارے مورخوں اور درسی کتب نگاروں کو اپنوں اور غیروں کے بارے میں اس طرح کے یک طرفہ طرز فکر سے اجتناب کرنا چاہئے۔

کتاب کے آغاز میں ہی قاری کو ایک لفظی مخمصے سے سابقہ پڑتا ہے۔ منشی دیبی پرشاد لکھتے ہیں 'کتاب کے دو حصے ہیں۔ اول حصہ نواب بیرم خان کی "حقیقت" اور حصہ دوم نواب عبدالرحیم کی "سرگزشت" کے بارے میں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حالات زندگی لکھتے ہوئے ایک کے بارے میں سیدھا سیدھا "سرگزشت" اور دوسرے کے بارے میں "حقیقت" کا لفظ استعمال کر کے خواہ مخواہ کی الجھن کیوں پیدا کی گئی ہے۔ منشی صاحب بیرم خان کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کونسی ایسی "حقیقت" کا انکشاف کرنے والے ہیں جن کے بارے میں محققین اور قارئین کی دو رائیں ہیں۔ نامعلوم تصحیح و تحشیہ کے وقت ڈاکٹر حسن علی بیگ کی نظر سے یہ نکتہ کیسے اوجھل رہ گیا۔

کتاب کا غالباً سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں بیرم خان کے علم و فضل سے روایتی لگاؤ اور اکثر اکابرین مغلیہ کی طرح شعر و شاعری سے حیرت انگیز شغف کا ذکر ہے۔ بیرم خان کا شعر ہے

نشان شب رواں دارد سر زلف پریشانش
دلیل روشن است ایک چراغ دیر وامانش

لیکن عبدالرحیم خان کے تخیل کی بلند پروازی اور قادر الکلامی اپنے نامور والد بیرم خان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تکملہ تزک جہانگیری میں لکھا ہے' وہ بہادری اور سرداری میں تو لاثانی تھا ہی' فارسی اور ہندی میں اچھے شعر کہتا تھا۔ اس کے چند فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز این قدر کہ دلم سخت آرزو مند است
نکیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست
نگاہ اہل محبت تمام سوگند است
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم
کہ مشتری چہ کس ست و بہاے من چند است
ازاں خوشم بسخن ہائے دلکش تو رحیم
کہ اند کے باوا ہاے عشق مانند است

آخر میں اس خوبصورت کتاب کے اختتامیے کے بارے میں ایک گزارش: منشی دیبی پرشاد صاحب اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں "سنا ہے کہ خانخانان کے حالات میں ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کا نام "ماثر رحیمی" ہے۔ مگر وہ اب تک باوجود تلاش ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔" لگتا ہے جیسے یہ کتاب کے فٹ نوٹ کا کوئی جملہ ہو۔ زیادہ بہتر یہ تھا کہ اس کا ذکر کتاب کے تعارف

یا مقدمے میں کہیں ہوتا۔ کتاب کے آخر میں ایسے بے جوڑ جملے کا کیا جواز ہے؟ آخر جملہ معترضہ کا بھی کوئی محل ہوتا ہے، نہ یہ کہ اس کا پیچھے سے کوئی ربط ہی نہ ہو اور آگے تو خیر کچھ ہے ہی نہیں۔ ممکن ہے پرانے "ماخذوں" میں کتاب کو یوں بے محابا ختم کر دینے کا رجحان موجود ہو۔ تاہم تاریخ کے طالب علم کم از کم اس قدر ذوق تو رکھتے ہی ہیں کہ اختتامیے کا ایسا اکھڑا اسلوب ان پہ بھی گراں گزرے گا۔

ڈاکٹر حسن علی بیگ اپنے حاشیے میں منشی صاحب کے اس عجیب و غریب اختتامی فقرے پر قارئین کے متوقع تاثر کو یہ بتا کر زائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کتاب دستیاب ہو چکی ہے اور تین جلدوں میں ہے۔ تاہم ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کتاب کے اس آخری فقرے سے معاً" پہلے جہاں عبدالرحیم خان کے ہندی اشعار کا ترجمہ ختم ہوتا ہے "کتاب وہیں ختم کر دینی چاہیے تھی۔ بہرحال تاریخ ہندوستان کے ضمن میں مسلم مورخین کی نسبت ہندو مورخین کے ہاں تعصب کا رنگ بہت ہی زیادہ شوخ ہے بلکہ ان کی دیدہ دلیری غیر جانبدار طبائع پر گراں گزرتی ہے۔

✣ ✣ ✣

اقبال اکادمی پاکستان،
لاہور کی خصوصی پیش کش

کلیاتِ اقبال

فارسی

(خاص الخاص ایڈیشن)

- اغلاط سے پاک۔
- مضبوط اور پائیدار جلد مع گولڈن ڈائی خوبصورت حاشیہ۔
- عمدہ، معیاری کتابت۔
- درآمد شدہ اعلیٰ قسم کا کاغذ۔

قیمت : ۱۰۰۰ روپے

(ایک نسخے کی خریداری پر بھی ۴۰ فیصد شرح رعایت دی جائے گی۔)